رسائل و مسائل

نماز اور خطبۂ جمعہ کی زبان

۱۔ کیا یہ امر واقعہ ہے کہ امام اعظم یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اجتہاد تھا کہ نماز عجمی زبان میں پڑھنا جائز ہے؟ اگر ایسا تھا تو کیا علماء دین امام صاحب کے اس اجتہاد پر از سر نو غور فرما کر نماز کے کسی عجمی زبان میں پڑھے جانے کی بابت جواز یا عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمائیں گے؟

(۲) آیۂ کریمہ "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ" میں بحالت سکر نماز پڑھنے کی نہی فرمائی گئی ہے۔ اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ ایسی حالت میں انسان جو کچھ کہتا ہے اس کو سمجھتا نہیں اس سے ثابت ہوا کہ نماز کی صحت کے لیے ایک ضروری شرط یہ ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کو پڑھنے والا سمجھے بھی۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنی مادری زبان میں فریضۂ نماز کو ادا کرتا ہے اور جو کچھ وہ اس نماز میں پڑھتا ہے اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھتا ہے تو کونسی وجہ ہے کہ اس کی ایسی نماز جائز اور مقبول نہ ہو؟

(۳) یا علماء کرام کے نزدیک عیدین اور جمعہ کا خطبہ مخاطبین کی مادری زبان میں دیا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ کہا جائے گا کہ عیدین اور جمعہ کا خطبہ عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں دیا جانا سنت نبوی کے خلاف ہے اس لیے ناجائز ہے۔ لیکن سنت نبوی یہ تھی کہ ایسے خطبہ کے دوران میں جو کچھ حضور پرنور کی زبان فیض ترجمان سے

نکلے اس کو سامعین سُنیں اور سمجھیں اور اس میں جو کچھ اوامر و نواہی ہوں اُن پر کاربند ہونے کی کوشش کریں اور جو کچھ حکم اور نصائح ہوں ان سے سبق آموز ہوں۔ وہ صورت جس میں سامعین میں سے ۹۹ فیصدی خطبہ کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے ہوں وہ ان اوامر و نواہی سے جو خطبہ میں بیان کیے جاویں کیونکر کسی قسم کا استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ایسا خطبہ کیونکر سنت نبوی کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے؟

عیدین اور جمعہ کے خطبہ کو عربی زبان تک محدود رکھنے سے جو مواقع شارع اسلام نے اوامر و نواہی شرعیہ کی اشاعت کے کافۃ المسلمین کے لیے پیدا فرمائے ہیں ان کا سدباب ہوتا ہے یا نہیں اور خطیب کا خطبہ ایسی صورت میں ایک فعل عبث ہو جاتا ہے یا نہیں جبکہ اس کے مفہوم کو سامعین میں سے کوئی یا اکثر نہیں سمجھتے۔

میں جانتا ہوں کہ بعض لوگ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں "علمی" کی اردو کی نظمیں پڑھتے ہیں مگر میرا یہ خیال ہے کہ ان کا یہ عمل علما کے مفتی بہ طریقہ کے خلاف ہے اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ علما اس مسئلہ کے متعلق خاص طور پر توجہ فرما کر اپنا فتویٰ عوام کے فائدے کے لیے صادر فرمائیں۔ فقط

محمد ذکاء اللہ خان۔ از دتیا۔

ترجمان القرآن۔ یہ درحقیقت ایک استفتاء ہے جس کے اصل مخاطب علماء کرام ہیں۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر کو نہ منصب افتاء حاصل ہے، نہ وہ اس کا اہل ہے کہ مسائل شرعیہ میں فتوی دینے کی ذمہ داری اٹھا سکے، مگر سائل محترم نے حسن ظن سے کام لے کر اس سے بھی خواہش کی ہے کہ اپنی تحقیق بیان کرے، لہذا مختصر طور پر امور مسئول عنہا کے متعلق احکام شریعت کی توضیح کی جاتی ہے اس توضیح کی حیثیت ہرگز کسی فتوے کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف اس غرض کے لیے ہے کہ حضرات علماء ان معروضات پر غور فرمائیں اور اگر مبنی برصواب پائیں تو قبول کر لیں۔

چند ضروری مقدمات قبل اس کے کہ اصل بحث پر کچھ عرض کیا جائے، چند مقدمات ذہن نشین کر لیجیے کہ ان سے ہمارے آئندہ بیانات کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

(۱) یہ امر مسلم ہے کہ شریعت حقہ کی بنیاد حکمت اور مصلحت پر قائم ہے۔ شارع حکیم نے کوئی حکم بھی بے معنی اور بے مقصد نہیں دیا ہے، نہ کسی حکم کو بجا لانے کا طریقہ مقرر کرنے میں کہیں حکمت و مصلحت کو نظر انداز کیا ہے۔ جب یہ مسلم ہے تو لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت کا صحیح اتباع تفقہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ کسی کام کا حکم دینے یا کسی فعل سے منع کرنے میں شارع کے پیش نظر کونسا مقصد اور کونسی مصلحت ہے، اور جو شخص یہ نہیں سمجھتا کہ کسی حکم کی بجا آوری کے لیے شارع نے جو عملی صورت مقرر کی ہے اس خاص صورت میں کیا حکمت مدنظر ہے، اور اصل مقصد کی تحصیل میں کون کونسا جزئیہ کس کس طرح مدد گار ہوتا ہے، اس کے لیے زندگی کے مختلف احوال میں شریعت کا صحیح اتباع کرنا بہت مشکل بلکہ تقریباً محال ہوگا۔ اس کے پاس شریعت کا صرف جسم ہوگا، اس کی روح نہ ہوگی۔ وہ محض استخوان کا مالک ہوگا، مغز کو نہ پا سکے گا۔ بعض حالات میں نہیں بلکہ اکثر حالات میں وہ اس طرح عمل کرے گا کہ بظاہر تو وہ شارع کے احکام کی پیروی ہوگی، مگر درحقیقت شارع کے اصلی مقاصد فوت ہو جائیں گے، کیونکہ اس کی نگاہ احکام کی مجرد عملی صورتوں اور ان کے جزئیات پر ہوگی۔ ان احکام میں جو مصالح اور مقاصد پوشیدہ ہیں وہ اس کی نظر سے اوجھل ہی رہیں گے، پھر کس طرح وہ مقاصد و مصالح کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر و تبدل کر سکے گا؟

(۲) یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لیے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام از منہ و امکنہ اور تمام احوال میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالت اور عہد

صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو ہو بہو تمام زبانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا ردوبدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روح اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ایک موٹی سی مثال لے لیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لیے سورج کی حرکت کے لحاظ سے اوقات مقرر فرمائے ہیں اس لیے کہ عرب اور ربع مسکون کے بیشتر حصوں کے لیے تعین اوقات کی یہی صورت مناسب ہے لیکن اگر کوئی شخص قطبین کے قریب رہنے والوں کے لیے بھی نمازوں کے اوقات معین کرنے میں وہی سورج کے طلوع و غروب اور سایہ کے اتار چڑھاؤ کا لحاظ کرے تو بظاہر یہ شارع کے منصوص احکام کی حرف بحرف پیروی ہوگی، مگر درحقیقت اس سے شارع کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور اس کا شمار خلاف ورزی احکام میں ہوگا۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ ترک صلوٰۃ اور اسقاط فرض ہے پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار، صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے، اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور اس کے طرز عمل سے اقرب ہو۔

(۳) مگر تفقہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان محض اپنی عقل و فہم کی پیروی کرنے لگے اور اس کے پیچھے پیچھے جدھر چاہے نکل جائے خواہ وہ حدود شریعت سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی عقل پرستی وہ چیز نہیں ہے جس کو اسلام کی اصطلاح میں "تفقہ" کہتے ہیں، بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآن میں اتباع ہوا کہا گیا ہے ہوا پرستی کی لازمی خصوصیت افراط پسندی ہے، اور اسلامی "تفقہ" کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال اور توازن ہے۔ ہوا پرست ہر معاملہ میں کسی ایک مصلحت یا ایک فائدہ کا ایسا شیدائی بن جاتا ہے کہ اس کی

خاطر دوسرے مصالح اور فوائد سے آنکھیں بند کر لیتا ہے بخلاف اس کے تفقہ اسلامی تمام مصالح اور فوائد کا مناسب لحاظ کرتا ہے، اور کسی مصلحت کو اگر نظر انداز بھی کرتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ کوئی عظیم تر مصلحت اس چھوٹی مصلحت کی قربانی چاہتی ہو۔ پھر مصلحت اور مضرت کے معیار میں بھی اسلامی تفقہ اور ہوا پرستی کے درمیان اختلاف ہے۔ ہوا پرست اسلام کے معیار پر نہیں بلکہ اپنے رجحان طبع کے معیار پر مصلحت و مضرت کا تعین کرتا ہے اور مصالح میں سے بعض کو اہم اور بعض کو غیر اہم قرار دیتا ہے بخلاف اس کے اسلامی تفقہ کا مقتضا یہ ہے کہ آپ کی نظر اسلام کی نظر ہو۔ آپ اس چیز کو مصلحت سمجھیں جسے اسلام مصلحت سمجھتا ہے اور اس چیز کو مضرت سمجھیں جسے اسلام مضرت سمجھتا ہے، اور مختلف مصالح اور مضرات کے درجے مقرر کرنے میں وہی معیار مدنظر رکھیں جو اسلام کے پیش نظر ہے۔ پس کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ مجرد عقل پرستی کا نام تفقہ ہے، اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی عقل کی پیروی میں شریعت کے جس حکم کو جس طرح چاہے بدل دے ہرگز نہیں اور یقیناً نہیں۔ اسلامی تفقہ یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی نگاہ میں جس چیز کو مصلحت سمجھتے ہیں اس کی خاطر اُن بہت سی مصلحتوں کو قربان کر دیں جنہیں شارع نے اپنے احکام میں ملحوظ رکھا ہے، یا آپ بزعم خود جس مضرت کو اہم سمجھتے ہیں اس سے بچنے کے لیے ایسی بہت سی مضرتوں کو قبول کر لیں جن سے شارع آپ کو بچانا چاہتا ہے بلکہ اسلامی تفقہ یہ ہے کہ آپ شارع کی تمام مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان میں سے ایک ایک کو وہی اہمیت دیں جو خود شارع نے دی ہے، اور جزئیات میں تغیر و تبدل اس طور پر کریں کہ شارع کے قائم کیے ہوئے توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ یاد رکھیے کہ شارع کے تجویز کردہ طرز عمل میں تغیر صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب کہ تغیر احوال کی بنا پر اس کی پیروی سے کوئی ایسی مصلحت فوت ہوتی ہو جو آپ کے شخصی رجحان کے لحاظ سے نہیں بلکہ خود شارع کے نقطۂ نظر سے اہم ہو۔ پھر ایسی صورت میں بھی صرف

اس حد تک جزئی تغیر کیا جا سکتا ہے کہ اس اہم تر شرعی مصلحت کی حفاظت کے ساتھ دوسری شرعی مصلحتوں کو نقصان نہ پہنچے یا اگر پہنچے بھی تو وہ ایسی مصلحتیں ہوں جو شارع کی نگاہ میں نسبتہً زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوں۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تربیت یافتہ بزرگوں کے عمل سے احکام کے استنباط میں ایک قاعدہ کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ "شرعی عمل" اور "طبیعی یا عادی عمل" میں فرق کیا جائے۔ شرعی عمل سے مراد ایسا عمل ہے جو اس بنا پر اختیار کیا گیا ہو کہ شریعت کا منشا وہی خاص طرز عمل اختیار کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ اور طبیعی یا عادی عمل سے وہ طرز عمل مراد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اپنے شخصی و طبیعی رجحان یا اپنے خاص زمانے اور ملک کے اجتماعی حالات کے اقتضا سے اختیار کیا تھا۔ یہ دوسری قسم کا طرز عمل متعدد حیثیات سے ہمارے لیے سبق آموز اور موجب رشد و ہدایت ہو سکتا ہے، مگر اس سے شرعی احکام کا استنباط درست نہیں۔ دلیل شرعی صرف پہلی قسم ہی کا طرز عمل ہے۔ بعض معاملات میں ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہوتا ہے، حتّٰی کہ ہر شخص سرسری نظر میں اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر بعض امور، خصوصاً دینی امور میں یہ دونوں طرز عمل اس درجہ مخلوط ہوتے ہیں کہ ان کے درمیان فرق کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں ایک قسم کے طرز عمل کو دوسری قسم کے طرز عمل کی حیثیت دے لینے اور اس سے غیر مناسب نتائج اخذ کرنے کی غلطی اکثر پیش آئی ہے۔ اور بڑے بڑوں کو پیش آئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی وقت میں رسول بھی تھے، ایک انسان بھی تھے ایک عرب بھی تھے۔ ایک خاص زمانہ اور خاص اجتماعی ماحول کے رہنے والے بھی تھے۔ آپ کے ہر فعل میں خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی، یہ سب حیثیتیں ایک ساتھ موجود تھیں۔ ان مختلف حیثیات کے مخلوط ہونے کی وجہ سے یہ تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ کسی فعل میں کونسا حصہ آپ کی حیثیت رسالت سے تعلق

رکھتا ہے تاکہ اسے حجت شرعی بنایا جائے۔ اور کونسا حصہ آپ کی دوسری حیثیات سے متعلق ہے جو حجت شرعی نہیں۔ اس سے زیادہ اختلاط حیثیات صحابۂ کرام کے افعال میں ہے۔ ہمارے لیے ان کے عمل میں شرعی رہنمائی صرف اس حیثیت سے ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ تربیت پائی ہے اور آپ سے احکام شریعت کا براہ راست استفادہ کیا ہے اس حیثیت کے علاوہ ان کی دوسری حیثیات جس قدر بھی ہیں وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں، بہرحال کسی شرعی ہدایت کی حامل نہیں۔ اب ان کے افعال میں خصوصاً دینی افعال میں یہ تمیز کرنا بسا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی ہدایت پر مبنی ہے، کونسی ان کی رائے اور اجتہاد پر، اور کونسی ان کے خاص شخصی اور زمانی و مکانی حالات پر۔ یہاں امتیاز کا ذریعہ ہمارے پاس صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت کے وسیع اور غائر مطالعہ سے ہمارے اندر جو اسلامی بصیرت پیدا ہوتی ہے اس سے ہم شرعی عمل اور طبیعی و عادی عمل کے باریک فرق کو محسوس کرتے ہیں، اور ہمارا ذوق ہم کو بتاتا ہے کہ کونسی چیز طبیعت اسلام سے تعلق رکھتی ہے، اور کونسی اس سے غیر متعلق ہے، کونسی چیز مصالح شرعیہ کی حامل ہے اور کونسی نہیں، کونسی چیز اسلامی سسٹم کا ایک جزء ہے اور کونسی نہیں۔ اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے، کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتی، اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ صرف وہی چیز "شرعی" ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے، اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو "شرعی" کہتی ہے وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد نماز اور خطبہ جمعہ کی زبان کے مسائل پر الگ الگ غور کیجیے۔ اس لیے کہ ان دونوں مسئلوں کی نوعیتیں باہم مختلف ہیں، اگرچہ بظاہر ایک نظر آتی ہیں۔

نماز کی زبان نماز کی زبان کے متعلق آج کل عام طور پر اُسی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے۔

جس کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے یعنی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تاوقتیکہ تم یہ نہ جانو کہ کیا کہہ رہے ہو) لیکن درحقیقت اس آیت سے استدلال درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حَتّٰى تَعْلَمُوْا فرمایا ہے، حَتّٰى تَفْقَهُوْا یا حَتّٰى تَفْهَمُوْا نہیں فرمایا۔ علم اور فقہ و فہم میں جو باریک فرق ہے اس کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دوران نماز میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے کے معنی و مفہوم کو سمجھنا، اور ہر لفظ کے معنی کی طرف ملتفت رہنا ضروری ہے، اور جب تک یہ فہم اور التفات حاصل نہ ہو، نماز صحیح نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ بداہتہً غلط ہے۔ اگر ایک عربی نہ جاننے والے کی نماز محض اس وجہ سے صحیح نہیں ہو سکتی کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھتا ہے اسے نہیں سمجھتا، تو ایک عربی داں کی نماز بھی ایسی حالت میں درست ہونی چاہیے جبکہ وہ سمجھ سمجھ کر نہ پڑھ رہا ہو، اور اول سے لے کر آخر تک پوری نماز میں ایک ایک لفظ کے معنی کی طرف ملتفت نہ ہو۔ ایسی کڑی شرط کے ساتھ تو شاید مشکل ہی سے کوئی شخص روزانہ پانچوں وقت کی نمازیں صحیح ادا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی میں انسان پر ہر طرح کے حالات گزرتے ہیں، کبھی رنجیدہ ہوتا ہے، کبھی متفکر ہوتا ہے، کبھی کسی کام میں اس کا ذہن مشغول ہوتا ہے، کبھی غیر محسوس طور پر خیالات اور خطرات اس کے ذہن میں داخل ہو جاتے ہیں اور کافی دیر تک اس کو شعور بھی نہیں ہوتا کہ میرا ذہن کدھر بھٹک گیا۔ اگر نماز کے لیے یہ شرط ہو کہ ان سب دماغی و قلبی کیفیات سے بالکل خالی ہو کر انسان پورے شعور اور التفات کے ساتھ کھڑا ہو تو نماز ادا کرنا ہی مشکل ہو جائے لیکن یہ وہ سختیاں ہیں جو انسان خود اپنی عقل سے اپنے لیے پیدا کرتا ہے۔ شارع نے اس پر ایسی سختی نہیں کی، کیونکہ وہ اس کی فطری کمزوریوں کو خوب جانتا ہے۔ اس نے سمجھ اور التفات اور استغراق اور خشوع و خضوع کو نماز کا کمال اور اس کا حسن ضرور قرار دیا ہے، اور اس کی خواہش یہی ہے کہ انسان کی نماز ایسی ہی کامل اور حسین ہو، لیکن اس نے ان چیزوں کو شرط نماز قرار

نہیں دیا کہ بغیر ان کے نماز درست ہی نہ ہو۔

آیت کا صحیح مفہوم | قرآن کی آیت پر غور کیجیے۔ اگر سمجھنا اور معانی کی طرف ملتفت ہونا ہی صحت نماز کے لیے ضروری تھا اور اسی بنا پر حالت سکر میں نماز سے دور رہنے کا حکم دیا گیا تھا، تو پھر سکر ہی میں کونسی خصوصیت تھی؟ یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ جب تم متفکر ہو تو نماز سے دور رہو۔ جب تمہیں رنج یا پریشانی یا کسی اور قسم کی ذہنی مشغولیت لاحق ہو تب بھی نماز کے پاس نہ آؤ۔ جب تمہیں محسوس ہو کہ دوران نماز میں تمہارے خیالات کسی اور طرف بھٹک گئے ہیں تب بھی نماز توڑ دو اور پھر سے شروع کرو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کوئی قید بھی نہیں لگائی بلکہ صرف حالت سکر میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس حالت میں تم کو علم نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سکر میں کسی اور قسم کی بے خبری ہوتی ہے جو عدم فہم اور عدم التفات سے ماسوی ہے۔ اس حالت میں انسان کو یہ بھی شعور نہیں رہتا کہ وہ عبادت کے لیے کھڑا ہوا ہے یا کسی اور کام کے لیے قرآن پڑھ رہا ہے یا کچھ اور، قبلہ رخ بھی ہے یا نہیں۔ اس پر کچھ ایسی مدہوشی طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپے میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ قرآن پڑھتے پڑھتے کوئی شعر گانے لگے۔ یا خدا کا ذکر کرتے کرتے کچھ اور اول فول بک جائے۔ یا قبلہ رخ کھڑے کھڑے کسی دوسری طرف ڈھلک پڑے یا نماز پڑھتے پڑھتے بھول جائے کہ نماز پڑھ رہا ہوں اور ادھوری نماز چھوڑ کر کسی سے باتیں کرنے لگے یا مصلے پر سے کہیں چل کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا مقصد حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے دراصل ایسی ہی بے شعوری کی طرف اشارہ کرنا ہے اور مدعا یہ ہے کہ جب تم اپنی حماقت سے اپنے اوپر ایسی حالت طاری کر لو جس میں تم کو اپنی زبان اور اپنے دل و دماغ پر قابو ہی نہ رہتا ہو تو ہمارے دربار میں حاضر ہونے کی جرأت نہ کرو۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آیت مذکورۃ الصدر کا کوئی تعلق نماز کی زبان سے

نہیں ہے، اور اس سے یہ استدلال کرنا درست نہیں کہ نماز نادری زبان میں پڑھنا ضروری ہے جسے مصلی اچھی طرح سمجھتا ہو۔

ائمۂ مجتہدین کے اختلافات اب یہ سوال باقی رہ گیا کہ آیا نماز کا عربی زبان میں ہونا ضروری ہے؟ اور کیا غیر عربی میں نماز ناجائز ہے؟ اس سوال کا حل اپنے طریق پر عرض کرنے سے پہلے ہم ان اختلافات کو بیان کئے دیتے ہیں جو اس باب میں ائمۂ مجتہدین کے درمیان ہوئے ہیں، تاکہ مسئلہ کی صحیح شرعی حیثیت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

امام اعظم کا مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی رائے یہ ہے کہ فارسی میں (اور فارسی کی کچھ خصوصیت نہیں[1]، ہر زبان میں) نماز پڑھنا یا خدا کا نام لے کر ذبح کرنا، یا اذان دینا (بشرطیکہ وہ غیر عربی اذان معروف ہو اور اس کو سن کر لوگ جان لیں کہ اذان ہے) جائز ہے خواہ ایسا کرنے والا عربی پڑھنے پر قادر ہو یا نہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاِنَّهٗ لَفِىْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ یعنی وہ پہلی کتابوں میں بھی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن اپنے موجودہ نظم کے ساتھ پہلی کتابوں میں نہ تھا۔ پس لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ان کتابوں میں اپنے معنی کے اعتبار سے تھا اور جب وہ معنوی ہونے کے باوجود "قرآن" ہی تھا تو یہ ماننے میں کیا قباحت ہے کہ قرآن کا فارسی ترجمہ بھی معنیً قرآن ہے اور نماز میں اس کا پڑھنا جائز ہے۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا (اگر ہم اس کو عجمی قرآن بناتے) اس سے معلوم ہوا کہ اگر عجمی زبان میں بھی یہ معانی ادا کیے جاتے تب بھی وہ قرآن ہی ہوتا۔ مزید براں روایات میں آیا ہے کہ ایران

---

[1] ابو سعید البردعی نے امام صاحب کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ فارسی کے سوا کسی دوسری زبان میں پڑھنا درست نہیں لیکن کرخی نے لکھا ہے کہ امام اعظم کا صحیح مسلک یہ ہے کہ ہر زبان میں پڑھنا جائز ہے۔ صاحب ہدایہ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں ویجوز بای لسان کان سوی الفارسیہ ہو الصحیح۔

کے نومسلموں نے سلمان فارسی سے درخواست کی تھی کہ سورۂ فاتحہ ہم کو فارسی میں لکھ دیجیے۔ چنانچہ انہوں نے لکھدی اور وہ اس کو نمازوں میں پڑھتے رہے یہاں تک کہ جب ان کی زبانیں نرم ہوگئیں اور وہ عربی پڑھنے پر قادر ہوگئے تو انہوں نے عربی میں پڑھنی شروع کردی۔ ان دلائل کی بنا پر امام صاحب کی رائے یہ ہے کہ اگر غیر عربی میں نماز پڑھی جائے تو ادا ہوجائے گی، مگر وہ اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ سنت متوارثہ کے خلاف ہے۔ بلکہ ابوبکر رازی نے تو لکھا ہے کہ امام صاحب نے آخر میں اپنی اس رائے سے رجوع کرلیا تھا، اور امام ابویوسف اور امام محمدؒ کی رائے قبول کرلی تھی۔

صاحبین کا مذہب امام ابویوسف اور امام محمد کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عربی پڑھنے پر قدرت رکھتا ہو تو غیر عربی میں نماز پڑھنا درست نہیں۔ ہاں اگر وہ عربی کا تلفظ کرنے پر قادر ہی نہ ہو تو غیر عربی میں پڑھ سکتا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے (فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ) اور قرآن کے ترجمہ پر "قرآن" کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لہذا جس نماز میں قرآن کے بجائے اس کا ترجمہ پڑھا جائے وہ نماز ہی نہ ہوگی۔ مگر جو شخص عربی کے تلفظ پر قادر ہی نہ ہو اس کے لیے مجبوری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے۔ ایسے شخص کی نماز بالکل اسی طرح ہوجائے گی جس طرح اس شخص کی نماز جو رکوع و سجود سے عاجز ہو اور اشارہ سے ادا کرے۔

امام شافعی کا مذہب امام شافعی کا ایک قول وہی ہے جو صاحبین کا اوپر مذکور ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جو شخص عربی تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بغیر قرأت کے نماز ادا کرے۔ اگر اس نے فارسی ترجمہ پڑھا تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ کیونکہ کلام اللہ کا ترجمہ کلام اللہ نہیں، کلام الناس ہے۔ اللہ کا کلام صرف عربی قرآن ہے، بقولہٖ تعالیٰ انا انزلناہُ قرآناً عربیاً[1]

[1] اس بحث کی تفصیلات کیلیے ملاحظہ ہو کتاب المبسوط للسرخسی جلد اول صفحہ ۳۷۔ وفتح القدیر وشرح العنایۃ علی الہدایہ جزو اول ص ۱۹۹ تا ۲۰۱

مسئلہ کی پوری تحقیق ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سلف صالح کے پیش نظر سوال کی نوعیت صرف یہ تھی کہ اگر نماز غیر عربی میں پڑھی جائے تو ادا ہو بھی جائے گی یا نہیں؟ کسی نے کہا کہ ہوگی مگر مکروہ ہوگی کسی نے کہا کہ سرے سے ہوگی ہی نہیں۔ کسی نے کہا کہ عاجز کی نماز ہو جائے گی بالکل اُس طرح جیسے معذور کی نماز اشارہ سے ہو جاتی ہے لیکن موجودہ زمانہ کے مجتہدین کے سامنے سوال کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ وہ اس سوال پر اس حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں کہ آیا غیر عربی دان کی نماز عربی میں ادا بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ اور ایا غیر عرب کے لیے عربی میں نماز اولیٰ ہے یا اپنی مادری زبان میں؟ اب چونکہ صورت مسئلہ بدل گئی ہے، لہٰذا جواب مسئلہ کی صورت بھی بدل جانی چاہیے۔

مصالح شرعیہ نماز کے لیے کونسی زبان انسب اور اولیٰ ہے؟ اس سوال کے صحیح حل کا انحصار ایک دوسرے سوال کے صحیح حل پر ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں نماز کی حیثیت کیا ہے، اور اس سے کون کونسے شرعی مصالح وابستہ ہیں؟ اس سے پہلے ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلام کا اصل مقصد محض فرد کی تہذیب نفس اور اس کا تزکیہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ افراد کو فرداً فرداً پاک اور متقی بنا کر دراصل ایک اعلیٰ درجہ کی صالح جماعت بنانا چاہتا ہے جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے فرائض ادا کرے۔ اسی غرض کے لیے اس نے تمام عبادات اس طریقہ پر فرض کی ہیں کہ افراد میں رجوع الی اللہ کے ذریعہ سے تقویٰ کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ ان کو صالحین کی ایک جماعت بھی بناتی چلی جائیں۔ اور ان عبادات میں سب سے اہم عبادت نماز ہے جو تہذیب نفس بھی کرتی ہے قرآنی ہدایات کی اشاعت بھی کرتی ہے قرآن کی حفاظت بھی کرتی ہے اور مسلمانوں کو ایک جماعت بھی بناتی ہے۔ نماز کی ان مختلف حیثیات اور اسلام کے ان متعدد مقاصد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز محض ایک بندے کی اپنے خدا سے مناجات ہی نہیں ہے، اور محض ایک ایک فرد میں الگ الگ روح تقویٰ پھونکنے کا ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کا قوام بھی ہے اور انفرادی مصلحت سے

عظیم تر مصالح بھی اس سے وابستہ ہیں۔

اب دیکھیے کہ جہاں تک انفرادی مصالح کا تعلق ہے ان کے لحاظ سے ضروری ہے کہ انسان نماز میں جو کچھ پڑھے، اس کو سمجھے بھی تاکہ تہذیب نفس اور تزکیۂ روح کا مقصد پوری طرح حاصل ہو سکے۔ اس غرض کے لیے نماز کا اُس زبان میں ہونا مفید ہوگا جسے مصلّی جانتا اور سمجھتا ہو لیکن انفرادی مصالح سے اہم تر جو مصالح شارع کے پیش نظر ہیں ان کو یہ چیز نقصان پہنچا دے گی۔

اولاً قرآن کی حفاظت کا عظیم الشان مقصد اس سے بڑی حد تک فوت ہو جائیگا۔ جب لوگ قرآن کے ترجمہ کو بھی قرآن سمجھنے لگیں گے اور یہ خیال عام ہو جائیگا کہ عبادت اور تلاوت کے مقاصد کے لیے ترجمہ اصل کتاب کا قائم مقام ہے تو اصل کتاب سے اعتنا کم ہو جائے گا، اس کو یاد کرنیکا ذوق باقی نہ رہے گا۔ اور ترجمہ ہی کو عملاً بطورِ اصل لے لیا جائے گا۔

ثانیاً اصل کتاب اللہ سے بے اعتنائی اور تراجم کی طرف روز افزوں التفات کا نتیجہ دین کی خرابی کے سوا کچھ نہ ہوگا، کیونکہ ناقص اور باہم مختلف و متعارض ترجموں کے الگ الگ جماعتوں اور الگ الگ قوموں میں معتبر بن جانے سے اسلام کا انجام بھی وہی ہوگا جو مسیحیت اور یہودیت کا ہوا۔

ثالثاً اس سے امت کی وحدت کا خاتمہ ہو جائے گا اور اسلام میں لسانی قومیتوں کی بنا پڑ جائے گی۔ ہر زبان بولنے والوں کی نمازیں اور جماعتیں الگ الگ ہوں گی۔ ایرانی عرب کے پیچھے نماز نہ پڑھے گا۔ اور ترک ہندیوں کی جماعت میں شریک نہ ہوگا۔ ایک ہی جگہ بنگالیوں اور مدراسیوں اور پنجابیوں کی جماعتیں لسانی قومیت کی بنیاد پر الگ الگ قائم ہوں گی، اور نماز کے ٹکڑے ہوتے ہی امت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

ان عظیم تر اجتماعی نقصانات سے بچنے کے لیے ناگزیر ہے کہ نماز کے لیے ایک ہی بین الملّی زبان ہو اور وہ وہی زبان ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ رہا انفرادی نقصان تو اس کو دور

کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ نماز کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کے لیے ایک ہی عبارت مقرر ہے۔ تکبیر، تسبیح، تسمیہ، تعوذ، سورۂ فاتحہ، تشہد، ان سب کا ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹہ میں بآسانی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ عام طور پر جو سورتیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ بھی دس بارہ سے زیادہ نہیں ہیں اور بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ان کے ترجمے یاد کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں۔ اس کے بعد قرآن کی صرف لمبی لمبی سورتیں باقی رہ جاتی ہیں جو کبھی کبھار سورۂ فاتحہ کے ساتھ ملائی جاتی ہیں، سو اگر بعض یا بیش تر مصلی ان کو نہ سمجھیں تو یہ ایسی کونسی قباحت ہے جس سے بچنے کے لیے تمام اجتماعی مصالح کی قربانی گوارا کر لی جائے۔

دلائل شرعیہ | مصالح اور حِکَم سے قطع نظر کر کے جب ہم منقولی احکام پر غور کرتے ہیں تو ہمیں امام ابو یوسف اور امام محمد کا مسلک سب سے زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے بھی آخر کار اسی کی طرف رجوع فرمایا ہوگا۔

قرآن مجید میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ نماز میں قرآن کی تلاوت کرو۔ يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا۔ إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ..... فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا۔ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

یہ تمام آیات نماز میں تلاوت قرآن کا حکم دیتی ہیں اور ان میں القرآن (الف لام تعریفی کے ساتھ) کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کا اطلاق ترجمہ قرآن پر نہ لغوی حیثیت سے ہوتا ہے نہ معنوی حیثیت سے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر تصریح ہے کہ اسم قرآن کا مسمّٰی صرف عربی قرآن ہے اور کلام اللہ

وہی ہے جو عربی الفاظ کے ساتھ خدا نے نازل فرمایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے جو معنی بیان کیے جائیں گے، خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہوں، وہ نہ صرف یہ کہ قرآن نہ ہوں گے، بلکہ اس کے مثل بھی نہ ہوں گے۔ لہٰذا وہ کبھی قرآن کے قائم مقام ہو ہی نہیں سکتے۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ۔ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ۔ وَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ ۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ۔

یہ تصریح بھی قرآن ہی میں ہے کہ تحریف سے حفاظت کا وعدہ صرف اس کتاب سے متعلق ہے جو خدا کے پاس سے نازل ہوئی ہے۔ انسانوں کے کیے ہوئے تراجم سے متعلق نہیں ہے ان میں ہر طرح سے تحریف کا دروازہ کھلا ہوا ہے، خواہ وہ ارادی تحریف ہو یا مترجمین کے عجز اور ان کے عدم فہم اور ان کی قلتِ علم کی بنا پر ہو۔ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ۔ لہٰذا نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھنے والا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ لفظاً نہیں تو معنیً قرآن کی صحیح تلاوت کر رہا ہے۔

رجوع الی اللہ اور انابت اور خشیت جو نماز کی اصل جان ہے۔ اس کو پیدا کرنے کی خاصیت جیسی قرآنِ منزل من اللہ میں ہے ویسی کسی اور کلام میں نہ ہو سکتی ہے نہ پائی جاتی ہے۔ اس پر بھی خود قرآن شاہد ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔

ایسے صریح اور محکم شرعی دلائل کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ جو نماز ترجمہ

قرآن پڑھ کر ادا کی جائے وہ درست ہوجاتی ہے۔ مگر وہ ہونا کیسا، ہم تو کہتے ہیں کہ وہ کسی درجہ میں بھی ادائے فرض کے لیے کافی نہیں۔ البتہ جیسا کہ صاحبین نے فرمایا ہے اس شخص کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے جو عربی تلفظ پر قادر ہی نہ ہو۔ اس کے حق میں یہی فتویٰ مناسب ہے کہ جب تک وہ عربی میں نماز پڑھنے کے قابل نہ ہوجائے۔ اس کا فریضہ غیر عربی کے ساتھ ادا ہوجائے گا، اس لیے کہ وہ قانون اضطرار کے تحت آجاتا ہے۔ (باقی)۔

مرأة المثنوی

مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جن کی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسی سہولت مہیا کردی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کرسکتا ہے۔ کاغذ کتابت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت عہ سکۂ انگریزی ارعہ سکۂ عثمانیہ۔

دفتر رسالہ ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

کیا نجات کیلیے صرف کلمہ توحید کافی ہے؟

"ایک حدیث کے متعلق جناب سے تشفی مطلوب ہے۔

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ اس حدیث میں ایمان بالرسل کے بغیر جنت کی بشارت دی گئی ہے حالانکہ قرآن میں ایمان بالرسل پر جس شدت سے تاکید ہے ظاہر ہے تا آنکہ کوئی ایمان بالرسل کے بغیر نہ راہ ہدایت پا سکتا ہے نہ فوز و فلاح۔ نہ آخرت کی زندگی میں اس کے لیے کوئی حصہ ہے۔ نیز اس حدیث میں عمل صالح کی بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ اگرچہ اعمال صالحہ جزو ایمان نہیں ہیں مگر قرآن کریم میں تو آخرت کی کامیابی و کامرانی انعام و اکرام اور جنت کی بشارت اپنے صاحب ایمان اور صالح بندوں ہی کو دی گئی ہے جیسا کہ آیات ذیل سے واضح ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ..... جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ الآیۃ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ الآیۃ۔

وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ الآیۃ

ہماری سطح بین نظروں میں یہ حدیث قرآن کے خلاف واقع ہو رہی ہے۔ براہ کرم جناب اپنے تبحر علمی اور محققانہ نظر سے مستفید فرما کر مطمئن فرمائیں تو موجب صد ممنونیت۔

صفوۃ الرحمٰن نظام آباد۔

ترجمان القرآن سب سے پہلے یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے قرآن مجید میں بھی ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ (حم السجدہ: ۴)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ خدا ہی ہمارا رب ہے، پھر اس (قول) پر جم گئے ان پر ملائکہ اترتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) نہ خوف کھاؤ اور نہ رنج کرو اور اس جنت کی خوش خبری سے شاد کام ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے

دیکھیے یہاں بھی وہی بات دوسرے لفظوں میں کہی گئی ہے جو آپ کی نقل کردہ حدیث میں پائی جاتی ہے جس طرح اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ نجات اور بخشش اور دخول جنت کے لیے صرف توحید کا اعتقاد کافی ہے اور ایمان بالرسل اور عمل صالح کی ضرورت نہیں، اسی طرح مذکورہ بالا حدیث سے بھی ایسا نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ علی ہذا القیاس جس طرح قرآن مجید کی یہ آیت اُن آیات سے معارض نہیں جو آپ نے پیش فرمائی ہیں، اُسی طرح یہ حدیث بھی اُن آیات سے معارض نہیں۔

حدیث اور قرآن دونوں کو سمجھنے میں ایک غلطی عام طور پر پیش آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور کتب حدیث دونوں کو لوگ عام تصنیفات کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح دوسری کتابوں میں ایک ایک مضمون ایک ایک جگہ تمام و کمال بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح قرآن و حدیث میں بھی کی گئی ہو گی لیکن اصل معاملہ یہ نہیں ہے۔ قرآن ۲۳ سال کی مدت میں مختلف مواقع پر مختلف حالات اور ضروریات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔ اسی طرح احادیث میں حضور کے وہ اقوال جمع کیے گئے ہیں جو ۲۳ سال کے طویل زمانہ میں آپ نے مختلف مواقع پر مختلف حالات میں حسب ضرورت ارشاد فرمائے ہیں۔ ان دونوں میں ایک چیز تو اسلام کی مرکزی تعلیم ہے جسے بار بار مختلف طریقوں سے دوہرایا گیا ہے۔ اور دوسری چیز اسلامی ہدایت کی تفصیلات ہیں جن کو کہیں یکجا اور کہیں جدا جدا مختلف حالتوں اور مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان سب پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے، ورنہ اگر کسی ایک ٹکڑے کو کہیں سے

لے لیا گیا اور دوسرے متعلق اجزا سے صرفِ نظر کرکے اسی کو ایک مستقل چیز سمجھ لیا گیا تو یقیناً غلط فہمی واقع ہوگی۔

مثال کے طور پر قرآن میں کہیں تو صرف ایمان باللہ پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ اوپر منقول ہوا۔ کہیں صرف یوم آخر کے اقرار کی تاکید ہے (الانعام: ۴) کہیں خدا کے ساتھ یوم آخر کا ذکر ہے (سورہ بقرہ) کہیں خدا کے ساتھ رسولوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ (آل عمران: ۱۸) کہیں خدا کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی تعلیم ہے (النور: ۹) کہیں یوم آخر اور کتب الٰہی پر اعتقاد رکھنے کی شدید تاکید ہے۔ (النساء رکوع اول) کہیں خدا اور انبیاء اور ملائکہ کے انکار کو کفر و فسق قرار دیا گیا ہے (بقرہ: ۱۲) اور کہیں ایمان کے پانچ اجزاء پورے بیان کر دیے گئے ہیں، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالیوم الآخر (بقرہ: ۲۲) ان مختلف مقامات میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ایک مقام پر ایمانیات کو یکجا بیان کرکے دوسرے مقامات پر اُن میں سے ایک ایک دو دو کو حسب موقع و ضرورت زیادہ زور دے کر پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس اصل سے قطع نظر کرلے اور کسی ایک آیت کو لے کر یہ دعویٰ کر دے کہ مومن ہونے کے لیے صرف خدا کی توحید پر، یا محض خدا اور یوم آخر پر، یا فقط خدا اور رسولوں پر ایمان لانا کافی ہے، اور یہ گمان کرے کہ اجزائے ایمان میں سے بعض کا انکار کرکے بھی بعض کا اقرار انسان کے لیے نافع ہو سکتا ہے، تو دراصل یہ قرآن کی زبان اور اس کے اندازِ بیان سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا۔

اسی طرح قرآن میں کہیں صرف ایمان پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں ہے۔ اور کہیں ایمان کے ساتھ تقویٰ اور عمل صالح کو نجات کے لیے شرط ٹھیرایا گیا ہے، مثلاً وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَکُمْ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (آل عمران: ۱۸۰) اور وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

پھر اعمال صالحہ میں سے بھی کسی جگہ ایک کی تاکید ہے اور کسی جگہ دوسرے کی کہیں نماز اور زکوٰۃ پر زور دیا جا رہا ہے، کہیں راستبازی اور حسن معاملہ پر، کہیں عفت اور حفظ فروج پر، کہیں صلۂ رحمی اور قرابتداروں کے حقوق پر، کہیں مساکین و یتامیٰ کی مواسات پر، کہیں والدین کی خدمت پر، کہیں ازدواجی قانون کے حدود پر، کہیں اکل حلال اور ترک حرام پر۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ گویا فلاح و نجات کا مدار اسی پر ہے۔ اگر کوئی شخص ان احکام اور ہدایات کے پورے مجموعہ سے قطع نظر کر کے محض کسی ایک آیت کو لے اور اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ قرآن مجید محض ایمان پر نجات کی بشارت دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ عمل صالح ہو، یا اعمال صالحہ میں سے صرف نماز یا زکوٰۃ یا عفت یا صلۂ رحمی یا کسی اور چیز کو کافی سمجھتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ دوسرے حسنات بھی ہوں، تو یہ اس کی قلت تدبر کا نتیجہ ہوگا۔ قرآن تو اپنی مجموعی تعلیم میں فکری و عملی زندگی کے لیے ایک مکمل اسکیم پیش کرتا ہے جس میں ایمانیات، اخلاقیات، اور عملی قوانین سب اپنی اپنی مناسب جگہ پر ہیں۔ مگر اس نے ان چیزوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک خاص حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک ایک ہدایت کو وہ الگ الگ مناسب مواقع پر دلوں میں اتارتا جاتا ہے۔ کبھی کوئی خاص واقعہ پیش آگیا، دیکھا کہ ذہن اس وقت ایک خاص ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، فوراً وہ ہدایت نازل کر دی گئی اور اس قوت کے ساتھ نازل کی گئی کہ قلب و روح میں پیوست ہو گئی۔ کبھی کسی خاص گروہ کی تعلیم پر حضور کو مامور کیا گیا اور اس گروہ کے خاص حالات کو پیش نظر رکھ کر اسی قسم کی ہدایات دی گئیں جو ان کی اصلاح کے لیے ضروری تھیں۔ کبھی کوئی خاص تعلیم دینے کی ضرورت پیش آئی تو پہلے تمثیلوں سے، اقوام گذشتہ کی نظیروں سے، انبیاء کرام کے حالات سے، آفاق و انفس کے شواہد سے دلوں کو اس کی قبولیت کے لیے تیار کیا گیا پھر وہ تعلیم دی گئی تاکہ اس کا اثر ہو، اور وہ روح میں جذب ہو جائے۔ یہ انتہا درجہ کا حکیمانہ طریق تعلیم و

تربیت اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد محض ایک اسکیم اور ایک ہدایت نامہ مرتب کر دینا نہیں تھا، بلکہ درحقیقت اپنی اسکیم کو نافذ کرنا اور ایک جماعت کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا تھا جس کے لیے تدریج اور ترتیب اور موقع و محل کی مناسبت اور نفسیاتِ انسانی کی رعایت ناگزیر تھی۔

ٹھیک ٹھیک اسی حکیمانہ طریقہ کی پیروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے۔ ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ ہر وقت تبلیغ و تعلیم اور اصلاح و ہدایت میں مشغول رہتے تھے۔ ہر قسم کے لوگ آپ کے پاس آتے تھے۔ ہر ایک کی ذہنیت، ہر ایک کی استعداد، ہر ایک کی اخلاقی، اعتقادی اور عملی حالت جداگانہ تھی۔ اگر آپ ہر وقت ہر شخص سے ایک ہی لگی بندھی بات کہتے اور ایک ہی قسم کی ہدایات دے کر رخصت کر دیا کرتے تو آپ کو وہ کامیابی کبھی نصیب نہ ہوتی جس نے تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ حکیم مطلق کے شاگرد تھے، اور اس حکیم نے جو طریق ہدایت اپنی کتاب میں اختیار کیا تھا اسی کی پیروی آپ بھی کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم موقع و محل کی رعایت کے ساتھ ہوتی تھی۔ جس وقت جس بات کا موقع ہوتا تھا، اس وقت وہی بات آپ کی زبان سے نکلتی تھی، اور سیدھی دلوں میں اتر جاتی تھی۔ یہ چیزیں جو منتشر طور پر حدیثوں میں پھیلی ہوئی ہیں ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھیے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تعلیم کیا تھی اور آپ کس طرح اس کو ذہن نشین کراتے تھے۔ اگر آپ ان اکائیوں کو جوڑ کر ایک منظم عدد نہ بنائیں گے، اور ایک ایک فرد کو الگ الگ لیکر اس سے نتائج اخذ کرنے لگیں گے تو ویسی ہی غلطی پیش آئے گی جیسی آیات قرآنی کو متفرق طور پر دیکھنے سے پیش آسکتی ہے۔

اس قاعدہ کو ملحوظ رکھکر اب ان احادیث پر نظر ڈالیے جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیمات مختلف طریقوں سے بیان فرمائی ہیں۔

ایک مرتبہ آپ سفر میں تھے۔ ایک اعرابی نے آکر آپ کے اونٹ کی نکیل تھام لی اور عرض کیا

یارسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیے جو مجھ کو جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے۔ فرمایا تعبد اللہ ولا تشرک بہ شیئًا وتقیم الصلوٰۃ وتوتی الزکوٰۃ وتصل الرحم "اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر نماز کا پابند رہ۔ زکوٰۃ دے اور قرابتداروں کے حقوق ادا کر"۔ دیکھیے۔ یہاں ایک ایسا شخص سامنے ہے جو آپ کی رسالت کا قائل ہے۔ حیات اخروی کا قائل ہے۔ اسلام قبول کر چکا ہے۔ اس کو تمام ایمانیات اور اخلاقیات کی تفصیل مطلوب نہیں۔ وہ صرف ترقی درجات کے لیے ہدایت مانگ رہا ہے۔ آپ اس کی ضرورت کے مطابق اس کو تعلیم دیتے ہیں کہ جس عقیدہ پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اس میں مضبوط ہو جا، اور اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق ادا کیے جا۔

ایک دوسرے موقع پر کوئی اعرابی حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ مجھے ایسا عمل بتا جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے آپ نے فرمایا تعبد اللہ ولا تشرک بہ شیئا وتقیم الصلوٰۃ المکتوبۃ وتوتی الزکوٰۃ المفروضۃ وتصوم رمضان "وہ عمل یہ ہے کہ تو صرف اللہ کی بندگی کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائے، جو نماز فرض کی گئی ہے اس کا پابند رہے۔ جو زکوٰۃ مقرر کر دی گئی ہے وہ ادا کرتا رہے۔ اور رمضان کے روزے رکھے۔ اس نے کہا بخدا میں اس سے نہ زیادہ کچھ کروں گا نہ کم۔ جب وہ واپس چلا گیا تو حضور نے فرمایا جو شخص اہل جنت میں سے کسی کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرنی چاہتا ہو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔ اب حضور کی تعلیم اور اس شخص کے جواب اور پھر آپ کے آخری ارشاد پر غور کیجیے۔ ایک سچا مسلمان سامنے تھا۔ نبی کی ہر ہدایت کو صدق دل سے قبول کرنے کو تیار تھا۔ اس کو صرف یہ سمجھانے کی ضرورت تھی کہ خدا کی جنت میں داخل ہونے کے لیے بڑی بڑی ریاضتوں اور مجاہدوں کی حاجت نہیں، چلے کھینچنے اور رات رات بھر وظیفے

پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی دنیا داری کی زندگی میں اگر تو اپنے اعتقاد کو شرک سے پاک رکھے اور خدا کے عائد کیے ہوئے فرائض ادا کرتا رہے تو جنت تجھے مل سکتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسری قسم کی حدیث ملاحظہ کیجیے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب آپ نے ایک مشن پر بھیجا تو فرمایا کہ تم اہل کتاب کی ایک قوم میں پہنچو گے۔ سب سے پہلے ان کو اس بات کی دعوت دینا کہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دیں اور یہ تسلیم کریں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ جب وہ اس کو مان لیں تو ان سے کہنا کہ اللہ نے تم پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ اس کو بھی مان لیں تو کہنا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو تمہارے مالداروں سے لی جائے گی اور تمہارے غریبوں کو دیدی جائے گی۔ جب وہ اس کو بھی مان لیں تو خبردار ان کے مال کو ہاتھ نہ لگانا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ اسی نوعیت کی دوسری احادیث میں ہے امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوہ عصموا منی دماءھم واموالھم وحسابھم علی اللہ۔ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں تا آنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کا رسول ہے، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ پھر جب انھوں نے ایسا کر دیا تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا۔ اس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ہاتھ ہے) اور امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ ویومنوا بی وبما جئت بہ فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں تا آنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، اور مجھ پر اور ان سب باتوں پر ایمان لائیں جو میں لایا ہوں پھر جب انھوں نے ایسا کر دیا تو مجھ سے اپنی جانوں

اور مالوں کو بچا لیا۔ الّا یہ کہ ان کے خلاف کوئی حق قائم ہوجائے۔ اس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے) ان احادیث میں حضور نے اسلام کا دستوری قانون بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص خدا کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کو ماننے کا اقرار کرلے تو وہ دائرہ اسلام میں آجاتا ہے۔ یہ بات کہ وہ حقیقی مومن ہے یا نہیں اس کا فیصلہ اللہ کرنے والا ہے ہم اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں کہ لم اُمر ان اشق عن قلوب الناس ولا عن بطونہم[1]۔ عصمت جان و مال مجرد کلمہ توحید اور اعتقاد رسالت کے اقرار سے ثابت ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد کسی کو دست درازی کا حق نہیں رہتا البتہ اگر کوئی شخص خدا کا حق یا بندوں کا حق ادا کرنے سے انکار کرے تو اس کو جرم کے مطابق سزا دی جاسکتی ہے۔

دیکھیے یہاں کوئی خاص شخص پیش نظر نہ تھا بلکہ عام ہدایات دی جارہی تھیں، اس لیے صرف قانون کے حدود بیان کرنے پر اکتفا کی گئی۔ یہ نہیں فرمایا کہ اقرار توحید و رسالت اور ادائے فرائض سے ہر شخص کے لیے جنت واجب ہوجائے گی۔ نیز اس موقع پر آپ نے ہر شخص کو تمام ایمانیات اور عملی قوانین سے آگاہ کرنے کا حکم بھی نہیں دیا، کیونکہ یہاں صرف یہ سمجھانا مقصود تھا کہ اسلام اور غیر اسلام کی حد کیا ہے۔ اور اسلام کی سرحدیں داخل ہوتے ہی انسان کو کیا حقوق حاصل ہوجاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک اس آیت کے مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ۔ (اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انھیں چھوڑ دو)۔ پس کسی شخص کو ان قانونی ہدایات سے یہ نتیجہ نکالنے کا حق نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید و رسالت کے اقرار اور ادائے نماز و زکوٰۃ میں اسلام کو محدود رکھتے تھے اور ان کے سوا کسی اور چیز کی کوئی اہمیت آپ کی نگاہ میں نہ تھی۔

[1] مجھ کو لوگوں کے دل چیرنے اور ان کے باطن ٹٹولنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

اوپر اپنے دو قسم کی حدیثیں دیکھیں۔ ایک وہ جن کے مخاطب خاص لوگ تھے۔ ان میں آں حضرت صلعم نے ان لوگوں کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر تعلیم دی ہے۔ دوسری وہ جن کا موضوع انتظام عمومی تھا۔ ان میں حضور نے عام قانونی ہدایات دی ہیں اور اسلام و کفر کا امتیاز بیان فرمایا ہے۔ اب ان احادیث کو دیکھیے جن کے مخاطب خواص صحابہ تھے۔

ایک مرتبہ حضور سواری پر چلے جا رہے تھے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ کے ردیف تھے آپ نے تین مرتبہ ٹھیر ٹھیر کر آواز دی یا معاذ بن جبل۔ اور حضرت معاذ نے ہر مرتبہ عرض کیا لبیک یا رسول اللہ وسعدیک اس طرح تین مرتبہ پکار کر جب آپ نے مخاطب کو اچھی طرح اپنی جانب متوجہ کر لیا اور آپ کو یقین ہو گیا کہ جو بات آپ فرمانا چاہتے ہیں اس کو سننے والا خاص اہمیت کے ساتھ سنے گا تب فرمایا "جانتے ہو بندوں پر خدا کا کیا حق ہے؟" انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے فرمایا "اللہ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی بندگی کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں"۔ تھوڑی دور آگے چل کر پھر آواز دی یا معاذ بن جبل۔ انہوں نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ وسعدیک فرمایا "پھر جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے جبکہ وہ ایسا کریں"؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا "ان کا حق یہ ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے"۔ حضرت معاذ نے یہ سن کر پوچھا "کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت دے دوں"؟۔ فرمایا نہیں! ان کو بشارت نہ دو کیوں کہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے"۔

ایک اور موقع پر حضور اپنے خاص صحابیوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ یکایک آپ اٹھے اور تشریف لے گئے۔ جب بہت دیر گذر گئی تو صحابہ کو تشویش ہوئی کہ کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے ڈھونڈنے نکلے سب سے پہلے جو صاحب گئے وہ حضرت ابو ہریرہ تھے۔ یہ سرکار کو تلاش کرتے ہوئے انصار کے ایک باغ پر پہنچے جس کا دروازہ تلاش کے باوجود نہ ملا۔ آخر ایک چھوٹی سی نہر کے رستے اندر پہنچے۔ دیکھا

حضور تشریف فرما ہیں۔ آپ نے پوچھا کیسے آئے۔ انہوں نے ماجرا عرض کیا۔ آپ نے اپنی دونوں جوتیاں اٹھا کر انہیں دے دیں اور فرمایا انہیں لے جاؤ اور باغ کے پیچھے جو شخص ایسا ملے جو لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہو اور اس پر دل سے یقین رکھتا ہو اسے جنت کی بشارت دے دو۔ یہ اس حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں سب سے پہلے حضرت عمر ملے۔ انہوں نے پوچھا یہ جوتیاں کیسی ہیں انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین ہیں اور آپ نے مجھے ایسا اور ایسا کہنے کا حکم دیا ہے حضرت عمر نے یہ سن کر ان کے ایک زور کا دھپ رسید کیا اور کہا کہ واپس جاؤ۔ یہ گرتے پڑتے بھاگے اور جا کر حضور سے سارا معاملہ بیان کیا۔ اتنے میں حضرت عمر بھی پہنچ گئے۔ آپ نے پوچھا کہ عمر! کس چیز نے تم کو اس حرکت پر آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا آپ نے ابو ہریرہ کو ایسا اور ایسا کہنے کے لیے بھیجا تھا؟ حضور نے فرمایا ہاں۔ حضرت عمر نے عرض کیا ایسا نہ کیجیے۔ مجھے خوف ہے کہ لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ انہیں عمل کے لیے چھوڑ دیجیے۔ آپ نے فرمایا اچھا تو انہیں عمل کے لیے چھوڑ دو

ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاری حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ ایک سپید کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹے ہیں۔ یہ واپس ہو گئے۔ دوبارہ حاضر ہوئے تو آپ اٹھ چکے تھے۔ ان کو دیکھ کر فرمایا ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذٰلک الا دخل الجنۃ۔ جس بندے نے کہدیا کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور اسی پر جان دی وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا انہوں نے پوچھا وان زنیٰ وان سرق (اگرچہ اس نے زنا کی ہو؟ اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟) آپ نے فرمایا وان زنیٰ وان سرق۔ انہوں نے پھر یہی پوچھا اور آپ نے پھر یہی جواب دیا۔ انہوں نے سہ بارہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا ہاں وان زنیٰ وان سرق علیٰ رغم انف ابی ذر۔

ان تینوں حدیثوں پر غور کیجیے۔ مخاطب وہ لوگ ہیں جن کے کامل الاسلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ تعلیمات قرآنی اور قوانین اسلامی سے نہ صرف خوب واقف ہیں بلکہ ان پر پوری طرح عامل بھی ہیں

ان کے سامنے حضور نے جو کچھ فرمایا اس سے یہ اندیشہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی کہ وہ دوسرے ایمانیات اور اعمال صالحہ کو غیر ضروری سمجھ لیں گے۔ اس لیے ان کو آپ نے یہ حقیقت بتا دی کہ اسلام میں سب سے اہم چیز عقیدۂ توحید ہے، اور یہ ایسی چیز ہے کہ جس کا یہ اعتقاد درست ہو اور پوری طرح راسخ ہو جائے وہ اللہ کے عذاب میں گرفتار نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بالکل خدا کی رضا کا تابع کر دے اور راہ راست پر قائم ہو جائے۔ سچے موحد کے لیے آیات الٰہی سے انکار اور مرضات الٰہی سے انحراف دونوں ناممکن ہیں، لہٰذا اس کا موحد ہونا ہی اس کے صحیح الایمان اور طاہر الاخلاق اور صالح الاعمال ہونے کو مستلزم ہے۔ تاہم اگر وہ غلطی سے مرتکب گناہ ہو بھی جائے تو یقیناً وہ اپنے گناہ پر متنبہ ہوتے ہی توبہ کرے گا۔ اور اگر توبہ کی توفیق نہ بھی ملی تو بقدر گناہ سزا پا کر آخر کار ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ خلود فی النار کی سزا اس کو ہرگز نہیں مل سکتی۔

مذکورۂ بالا احادیث اور ان کی ہم معنی دوسری احادیث کا یہی مفہوم صحابۂ کرام نے سمجھا تھا اور یہی ان کا حقیقی مفہوم تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ خیال نہ کیا کہ بس عقیدۂ توحید ہی کافی ہے، اس کے بعد نہ رسالت کو ماننے کی ضرورت ہے، نہ کلام اللہ کو، اور نہ پاکیزگیٔ اخلاق مطلوب ہے، نہ خیریت اعمال۔ ایسا غلط مفہوم وہ کس طرح سمجھ سکتے تھے، جبکہ ان کو پوری طرح بتا دیا گیا تھا کہ اسلام کیا ہے اور اس میں کن چیزوں کا اعتقاد، کن عبادات کی پابندی، کن حدود کی حفاظت، کن قوانین کی اطاعت اور کن طریقوں سے اجتناب ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے یہ تعلیم صرف کاملین کو دی اور عوام کے سامنے اس کو بیان کرنے سے منع فرما دیا۔ معاذ بن جبل والی حدیث میں آپ نے اس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرما دی ہے کہ عام لوگ اس کو سن کر غلط فہمی میں پڑ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ والی حدیث میں ایک شخص کو یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے شاید عوام سے اس کو بیان کرنے کی اجازت دی تھی۔ خود حضرت عمر کو بھی ایسا ہی شبہہ ہوا تھا۔ لیکن دراصل حضور کا مقصد کامل الاسلام

لوگوں کو بشارت دینا تھا۔ چنانچہ جب حضرت عمر نے اپنا اندیشہ بیان کیا تو آپ نے ان کی رائے سے اتفاق فرمایا۔ اسی طرح حضرت ابوذر والی حدیث میں بھی کوئی شخص یہ شبہ نہیں کر سکتا کہ قال لا الٰہ الا اللہ سے مجرد زبانی قول مراد ہے۔ اس لیے کہ حضور نے دوسرے مواقع پر تصریح فرمائی ہے کہ دخول جنت کے لیے توحید پر کامل ایمان کی ضرورت ہے کہیں مستیقنا بھا قلبہ فرمایا۔ کہیں عبد غیر شاکٍ فرمایا۔ اور کہیں دوسرے الفاظ ارشاد فرمائے جو اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں

بہرحال یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جن احادیث میں توحید کی اہمیت بیان کی گئی ہے ان کا خطاب دراصل ان لوگوں سے ہے جو تمام شرائط کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہوں نہ کہ ان لوگوں سے جو مسلمان ہی نہ ہوں۔ پھر مسلمانوں کو بھی اعتقاد توحید پر دخول جنت کی بشارت دینے سے یہ مراد نہیں کہ بس خدا کی وحدانیت مان لو۔ پھر جس قسم کی بدعقیدگی، فسق و فجور اور بدعت و معصیت میں چاہو مبتلا ہو جاؤ۔ بلکہ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مسلمان کی کامیابی کا مدار سب سے بڑھ کر اعتقاد توحید کی صحت اور مضبوطی پر ہے۔ اس میں اگر خرابی آگئی تو پھر کوئی چیز نافع نہیں ہو سکتی اور اگر یہ صحیح و مضبوط ہو تو آخری کامیابی حاصل ہو کر رہے گی۔ اسی جہت سے اس معنی کی احادیث اس آیت قرآنی سے مطابق ہوتی ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔